بہترین نظمیں

حلقہ ارباب ذوق

سنہ ۱۹۴۳ء

کی

بہترین نظمیں

مرتبہ

حلقۂ اربابِ ذوق

ناشر

مکتبۂ اُردو لاہور

قیمت (عہ)

اتحاد پریس لاہور میں باہتمام چودھری نذیر احمد پرنٹر پبلشر چھپ کر مکتبۂ اردو لاہور سے شائع ہوئی

فہرس

اختر الایمان (پ سنہ ۱۹۱۸ء)
اظہار، ۱۱
پگڈنڈی، ۱۵
نئی صبح، ۳۰

امجد مجید (پ سنہ ۱۹۱۴ء)
دل دریا......، ۱۰۵
گاڑی ہیں، ۸۹

انجم رومانی (پ سنہ ۱۹۲۰ء)
زندگی، ۷۳

انور سردار (پ سنہ ۱۹۲۳ء)
ہرجائی، ۳۵

تصدق حسین خالد (پ سنہ ۱۹۰۰ء)
ایک کتبہ، ۲۸
حسنِ قبول، ۶۸

راشد، ن م (پ سنہ ۱۹۱۰ء)

خرابے، ۷۹

ریاض احمد (پ سنہ ۱۹۱۹ء)

خلا، ۴۳

سلام مچھلی شہری (پ سنہ ۱۹۱۹ء)

ایک پینٹنگ، ۳۹

شاد عارفی (پ سنہ ۱۹۰۳ء)

مشورہ، ۱۰۹

ضیا جالندھری (پ سنہ ۱۹۲۳ء)

صبح سے شام تک، ۵۷

گریز، ۴۹

ظفر، یوسف (پ سنہ ۱۹۱۴ء)

آخری سہارا، ۹۹

انجام، ۱۳

عبدالمجید بھٹی (پ سنہ ۱۹۰۲ء)

مراجعت، ۹۴

علی جواد زیدی (پ سنہ ۱۹۱۳ء)

دھارے کا موڑ، ۵۴

فیض احمد فیض (پ سنہ ۱۹۱۱ء)

اے دلِ بیتاب ٹھہر، ۲۷

مرے ہمدم مرے دوست، ۲۲

گوہر، الطاف (پ سنہ ۱۹۲۳ء)

سراب، ۴۷

محمد خلیل الرحمٰن (پ سنہ ۱۹۲۰ء)

خزاں کی رات، ۱۰۱

محمد صفدر (پ سنہ ۱۹۲۲ء)

صدائے رہرواں، ۳۳

کنارِ دریا، ۶۳

مختار صدیقی (پ سنہ ۱۹۱۹ء)

آتشدان کا بُت، ۶۱

فاشزم، ۹۱

مخمور جالندھری (پ سنہ ۱۹۱۵ء)

تلاش، ۱۸

میراجی (پ سنہ ۱۹۱۲ء)

ترقی پسند ادب، ۵۵

حرامی، ۷۰

دوسری عورت سے، ۸۵

ندیم، احمد قاسمی (پ سنہ ۱۹۱۶ء)

جدائی کی پہلی رات، ۶۷

نظر، قیوم (پ سنہ ۱۹۱۴ء)

ترغیب، ۵۳

تھکن، ۲۱ شام، ۷۵

پیش لفظ

سال کی بہترین نظمیں کتابی صورت میں شائع کرنے کے سلسلے کی یہ تیسری کڑی ہے۔ پہلی مرتبہ ہم نے مل جل کر مجموعہ خود ہی شائع کیا کیونکہ اس وقت حالات اتنے سازگار نہ تھے کہ کوئی ناشر جدید نظموں کے اس قسم کے مجموعے کو چھاپنے کی جرأت کرتا۔ دوسرے سال "دبستان، لاہور" والوں نے ڈرتے جھجکتے یہ بیڑا اٹھایا، اور اب اس سلسلے کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بعض دوسرے اداروں کی تقلیدی کوششوں کے علاوہ "مکتبۂ اردو لاہور" نے ہم سے یہ سالانہ انتخاب شائع کرنے کے لئے پانچ سال کا معاہدہ کر لیا ہے۔ گذشتہ دو سال میں ان مجموعوں پر مختلف قسم کے اعتراضات ہوئے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ جن کے جواب میں "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا" مگر چند غلط فہمیوں کا ازالہ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی موجودگی خود معترضین کے لئے مضر نظر آتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ نظموں کے اس مجموعے میں غزل اور گیت کو بار نہیں، درست، مگر غزل اور گیت نظم نہیں ہر چند موجودہ غزل اور گیت میں بھی ان چیزوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جو موجودہ نظم کا نمایاں پہلو ہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ نظموں کے انتخاب میں صوبجاتی تعصب روا رکھا جاتا

ہے۔ اس اعتراض کی وجہ شاید یہ ہے کہ معترضین کو بقول کسے شاعروں کے وہ چمکتے ہوئے نام نظر نہیں آتے جو اکثر مشاعروں کی جان ہوتے ہیں۔ اس کے جواب میں ہمیں یہی کہنا ہے کہ ہمارا مقصد بہترین نظمیں پیش کرنا ہے اور بس۔ یہ الگ بات ہے کہ پنجاب کے نوجوان نظم لکھنے والے عموماً زیادہ غور و فکر سے کام لیکر اردو نظم کو فروغ دے رہے ہیں جس کی بنا پر وہ ان مجموعوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

پھر اعتراض کیا گیا ہے کہ ان مجموعوں کی اکثر نظمیں بجائے خود بہت بلند نہیں ہوتیں۔ بجا، لیکن یہ نظمیں صرف ایک سال کی شائع شدہ نظموں سے منتخب ہوتی ہیں۔ نہ کہ اردو نظم کے تمام ذخیرہ کا انتخاب۔ ظاہر ہے کہ اس قلیل عرصے میں محدود لکھنے والوں کی ہر نظم شاہکار نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہمیں ان نظموں کو بہترین کہتے وقت ان کی تقابلی قدر و قیمت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

اس سال ان نظموں میں سے اکثر پر علیحدہ مضامین لکھے جا رہے ہیں جو عنقریب ہی ایک علیحدہ کتابی صورت میں شائع کئے جائیں گے۔ اس لئے یہ کچھ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسی مجموعہ میں اس اندازِ نظر کی مکرر وضاحت کر دیں۔

آخر میں ہم اُن تمام شعرا کے مشکور ہیں جن کی نظمیں اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ تنگیٔ وقت کیوجہ سے ہم اُن سے فرداً فرداً اجازت حاصل نہ کر سکے۔ توقع ہے کہ متعلقہ حضرات رسمی باتوں پر خوش فہمی کو ترجیح دیں گے۔

شیر محمد اختر

سکرٹری
حلقۂ ارباب ذوق

مرکز حلقۂ ارباب ذوق
وائی، ایم، سی، اے، لاہور

نظمیں

جنوری:

اظہار،

انجام،

پگڈنڈی،

تلاش،

تھکن

مرے ہمدم مرے دوست،

اظہار

تو بھی تقدیر نہیں۔ درد بھی پائندہ نہیں

تیرے رُخساروں سے وابستہ مرا عہدِ وفا
رات کے آخری آنسو کی طرح ڈوب گیا

خواب انگیز نگاہیں، وہ لبِ درد فریب
اِک فسانہ ہے جو کچھ یاد رہا کچھ نہ رہا

میرے دامن میں نہ کلیاں ہیں نہ کانٹے نہ غبار
شام کے سائے میں واماندہ سحر بیٹھ گئی

کارواں لوٹ گیا مل نہ سکی منزلِ شوق
ایک اُمید تھی سو خاک بسر بیٹھ گئی

ایک دوراہے پہ حیران ہوں کس سمت بڑھوں
اپنی زنجیروں سے آزاد نہیں ہوں شاید؟
میں بھی گردشِ گہِ ایّام کا زندانی ہوں

درد ہی درد رہوں۔ فریاد نہیں ہوں شاید؟
زیرِ مژگاں تپشِ آہ کے پگھلائے ہوئے
ڈبڈباتے ہوئے تاروں سے مجھے کیا لینا؟
تیرے آنسو مرے داغوں کو نہیں دھو سکتے
تیرے پھولوں کی بہاروں سے مجھے کیا لینا؟
اپنے انجام کی تشویش اب آئندہ نہیں

اخترالایمان

انجام

میں اپنی زندگی کی لاش سے لپٹ کے گا چکا
میں اپنی خواہشوں کی موت پر خوشی منا چکا
میں اپنے آنسوؤں کی چلمنوں سے مسکرا چکا

یہ تھی صدائے سازِ غم
اَلم ، اَلم ، اَلم ، اَلم
اِسی صدا کے ساتھ ساتھ میں چلا قدم قدم

اِسی صدا سے میں چراغِ آرزو جلا چکا
میں اپنی زندگی کی لاش سے لپٹ کے گا چکا

طلسم خانۂ خیال میں حیات کٹ گئی
سہارے لیتے لیتے عمرِ بے ثبات کٹ گئی
ستارے گنتے گنتے میری ساری رات کٹ گئی

سکوں کی آرزو رہی
تلاشِ رنگ و بُو رہی
دلِ جنوں نصیب کو اُمید گفتگو رہی
زباں تک آنے بھی نہ پائی تھی کہ بات کٹ گئی
طلسم خانۂ خیال میں حیات کٹ گئی

یوسف ظفر

پگڈنڈی

ایک حسینہ درماندہ سی، بے بس، تنہا دیکھ رہی ہے
جیسے یونہی بڑھتے بڑھتے رنگِ افق پر جا جھولے گی
جیسے یونہی افتاں خیزاں جا کے تاروں کو چھولے گی
راہ کے پیچ و خم میں کوئی راہی الجھا دیکھ رہی ہے

انگڑائی لیتی، بل کھاتی، ویرانوں سے آبادی سے
ٹکراتی، کتراتی، لڑتی، خشکی پر گرداب بناتی
اٹھلاتی، شرماتی، ڈرتی، مستقبل کے خواب دکھاتی
سایوں میں سستاتی، مڑتی، بڑھ جاتی ہے آزادی سے

راہی کی آنکھوں میں ڈھلتی، گرتی اور سنبھل جاتی ہے
ٹھنڈی چھاؤں میں تاروں کی سیمیں خواب کا دھارا بنتی

دن کی روشن امیدوں میں میداں میں آوارہ بنتی
ندیوں سے چشموں سے ملتی کوسوں دور نکل جاتی ہے

پھولوں کے اجسام کچلتی، ذرّوں کے فانوس جگاتی
درماندہ اشجار کے نیچے شاخوں کا واویلا سنتی
ہر نووارد کے رستے میں نادیدہ کچھ جال سے بُنتی
بڑھ جاتی ہے منزل کہہ کر کلیاں زیرِ خاک سُلاتی

غم دیدہ پس ماندہ راہی تاریکی میں کھو جاتے ہیں
پاؤں راہ کے رخساروں پر دھندلے نقش بنا دیتے ہیں
آنے والے اور مسافر پہلے نقش مٹا دیتے ہیں
وقت کی گرد میں دبتے دبتے ایک فسانہ ہو جاتے ہیں

ایک حسینہ درماندہ سی، تنہا تنہا دیکھ رہی ہے
جیون کی پگڈنڈی یوں ہی تاریکی میں بڑھ جاتی ہے
کون ستارے چھو سکتا ہے، راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

راہ کے پیچ و خم میں کوئی راہی الجھا دیکھ رہی ہے

یہ سورج یہ چاند ستارے راہیں روشن کر سکتے ہیں
تاریکی آغازِ سحر ہے، تاریکی آرام نہیں ہے
کس کی ان دیکھی راہوں میں کوئی نور آشام نہیں ہے،
ہم سے اتنا بن پڑتا ہے جی سکتے ہیں مر سکتے ہیں۔

اخترالایمان

تلاش

ریت پر ڈھونڈنے آیا ہوں وہ قدموں کے نشاں
میرے اور تیرے حسیں سایوں نے چھ سال ہوئے
ساحلِ بحر کے سینے پہ بنایا تھا جنہیں
ڈھونڈنے آیا ہوں اُن گیتوں کی میٹھی تانیں
ہم نے مل جل کے بڑے شوق سے گایا تھا جنہیں

دیکھ پانی کے تموّج کی طرف غور سے دیکھ
اُٹھ رہا ہے یونہی طوفان مرے سینے میں
دیکھ چھوٹے بڑے پھیلے ہوئے قدموں کے نقوش
ساحلِ بحر کے سینے پہ ہیں یوں بکھرے ہوئے
جیسے دِل پر غم و آلام کے چرکوں کے نشاں

دیکھ بپھری ہوئی امواج کا رقصِ بسمل
اپنے قدموں کی طرح اُن کے نقوشِ کفِ پا
وقت کے ہاتھوں سے بے وقت مٹے جاتے ہیں
کل کوئی آنکھ جنہیں دیکھ نہ پائے گی کہیں
سُن ہمارا ابھی کوئی گیت ہے ان کے لب پر
کسی مجروح مغنّی کی طرح موجوں کو
نغمہ و شعر طرازی کی نہیں ہے فرصت
ایک بھی گیت انہیں یاد نہیں، رنج نہ کر
یاد رکھتا ہے بھلا کون پرانے قصّے
اپنی بات اور ہے، ہم نے تو محبت کی ہے
اور ہم بھُول کہاں سکتے ہیں اِس ساحل کو

انہیں قدموں کے نشانوں سے ذرا بچ کے چلیں
چاہتا ہوں کہ مری طرح اگر کوئی غریب
یہ حسیں نقش، یہ بیتی ہوئی اُلفت کے نشاں

ڈھونڈنے آئے تو ناکام نہ واپس جائے
ہم بھلا کیسے کچل سکتے ہیں یہ نقشِ جمیل
ہم ستم دوست نہیں۔ ہم نے محبت کی ہے
چلو ۔۔۔ قدموں کے نشانوں سے ذرا بچ کے چلیں

مخمور جالندھری

تھکن

رات کی نیلی سیاہی لے چکی ہے اپنے دامن میں سنہری شام کو
حسن کی تاریک رعنائی کی دنیا پر ہے رنگِ بے دلی چھایا ہوا
نیم جاں ذرّوں کی مبہم گردشوں پر نغمۂ خاموش لہرایا ہوا
تھم گئی ہے شعلہ پرور دن کے محشر خیز ہنگاموں کی جُوئے تُند رَو
رفتہ رفتہ بہتے بہتے اپنی منزل کے سکوتِ مضمحل کی چھاؤں میں
تابِ جنبش ہی نہیں بے کیف تنہائی کی زنجیروں سے بوجھل پاؤں میں
فکر کی آلائشوں میں غرق ہے تارِ نفس موہوم احساسات کا
شمع رو تارے نظر آتے ہیں جیسے دل گرفتہ پھول کملائے ہوئے
جن کی تابانی کے نغمے خارزاروں کے شگوفوں سے ہیں بل کھائے ہوئے
ہر طرف اِک آنے والے خوابِ نامعلوم کا پھیلا ہے بحرِ بیکراں
جس کی سطحِ پُرسکوں پر لوٹتی ہے زندگی کی خستہ ساماں چاندنی
نیند — یعنی موت کے سانچے میں آخر ڈھلنے والی غم بداماں چاندنی

قیّوم نظر

مرے ہمدم، مرے دوست!

گر مجھے اس کا یقین ہو، مرے ہمدم، مرے دوست،
گر مجھے اس کا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن،
تیری آنکھوں کی اُداسی، ترے سینے کی جلن،
میری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی
گر مرا حرفِ تسلّی وہ دوا ہو جس سے
جی اُٹھے پھر ترا اُجڑا ہوا بے نور دماغ،
تیری پیشانی سے دُھل جائیں یہ تذلیل کے داغ،
تیری مدقوق جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے بھائی، مرے دوست،
میں تجھے بھینچ لوں، سینے سے لگا لوں تجھ کو

روز و شب، شام و سحر، میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سُناتا رہوں ملکے، شیریں،
آبشاروں کے، بہاروں کے، ہمن زاروں کے گیت
آمدِ صبح کے، مہتاب کے، سیاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں
کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس طرح عارضِ محبوب کا شفاف بلور
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے جھکتی ہے سرِ شاخ سے خود برگِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے۔
یونہی گاتا رہوں، گاتا رہوں، تیری خاطر
گیت بُنتا رہوں، بیٹھا رہوں، تیری خاطر

پر مرے گیت ترے دُکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مونس و غمخوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہم آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفّاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اِس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں،
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا،

فیض احمد فیضؔ

فروری :

اے دلِ بیتاب ٹھہر،

ایک کتبہ،

نئی صبح،

اے دلِ بیتاب ٹھہر

تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھُوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونو عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندئ آداب ابھی

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
یہ گرانبارئ آداب بھی اُٹھ جائے گی

خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے

فیض احمد فیض

ایک کتبہ

شیر دل خان!
میں نے دیکھے تیس سال
پے بہ پے فاقے
مسلسل ذلتیں،
جنگ!
روٹی!!
سامراجی بیڑیوں کو وسعتیں دینے کا فرض
ایک لمبی جانکنی
سو رہا ہوں اس گڑھے کی گود میں
آفتابِ مصر کے سائے تلے

میں کنوارا ہی رہا
کاش میرا باپ بھی ——
یوں کنوارا ——
کیا کہوں؟

تصدّق حسین خالد

نئی صبح

کالے ساگر کی موجوں میں ڈوب گئیں دھندلی آشائیں
جلنے دو یہ دیئے پرانے خود ہی ٹھنڈے ہو جائیں گے
بہہ جائیں گے آنسو بن کر، یونہی تھک کر سو جائیں گے
اندھے سایوں میں پلتے ہیں، مبہم سے غمگین فسانے
اس لرزاں دیوارِ الم سے آ ٹکراتے ہیں پروانے
دودِ فسردہ کی انگڑائی لے بن بن کر ٹوٹ رہی ہے
سرخ زباں کی نازک لو پر جاگ رہی ہے ایک کہانی
ٹوٹے پھوٹے جام پڑے ہیں، سونی سونی ہے کچھ محفل
دھوپ سے ڈھل کر بیت گئی ہے ساقی کی مجبور جوانی
کیا جانے کب سورج نکلے، بستی جاگے، غم مٹ جائیں

اختر الایمان

مارچ :

صدائے رہرواں ،

ہرجائی ،

صدائے رہرواں

سطحِ دریا پہ ہیں موجوں کے نقوش ؟
یہاں پانی نہیں، یہ سلسلۂ موج نہیں
ریت پر بن کے بگڑتی ہے ہوا کی تحریر
عرق آلودہ جبینوں پہ شفق کی بارش
اور کہسار میں بل کھاتی ہوئی راہ گزر
یہاں پانی نہیں اور راہ گزر ـــــ
ابتدا ؟ انتہا ؟ اک موجِ خیالات کا گم گشتہ راگ

ریت اُڑتی ہے کبھی۔ تیز ہوا چلتی ہے
خارزاروں میں ہوا، خشک درختوں میں ہوا
سُونے معبد میں ہوا
موت کے راگ دھندلکے میں بکھر جاتے ہیں

دُور سے ماؤں کے نوحے کی صدا آتی ہے

یہاں پانی نہیں۔ یہ سلسلۂ موج نہیں
ریت پر بن کے بگڑتی ہے ہوا کی تحریر

خشک بادل کبھی کہساروں ہیں
خشک چہرے سوئے گردوں نگراں
(خشک بادل بھی گرجتے تو ہیں —— برسیں گے کبھی ؟)
گونج کی لرزشیں بے آب چٹانوں میں رواں
گونج کی لرزشیں ہیں۔ پانی کی آواز نہیں
یہاں پانی نہیں یہ سلسلۂ موج نہیں
ریت پر بن کے بگڑتی ہے ہوا کی تحریر

کبھی آئے گی یہاں دشت میں پانی کی صدا ؟
کبھی آئے گی یہاں دشت میں پانی کی صدا ؟
اے خدا۔ اے مرے اجداد کے رب
اے مرے اجداد کے رب

محمد صفدر

(ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظم "ویسٹ لینڈ" سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

ہرجائی

ایک ہی تان پہ موقوف ہے سارا نغمہ
ایک ہی تان پسند آئے کہاں تک مجھ کو
ایک ہی پھول پہ بھونرے کی بسر کیسے ہو
کیا کوئی پھول نہیں اور کوئی پھول نہیں
پھول کھلتے ہیں ہزاروں تو چمن بنتا ہے
سینکڑوں رنگوں کے ملنے سے شفق کھلتی ہے
آسماں پر ہیں ستارے بھی ہزاروں لاکھوں
سیمگوں جسم کی لہریں مجھے مرغوب سہی
سرمگیں آنکھوں کا پھیلایا ہؤا جادو بھی
بن کے ساون کی گھٹائیں مجھے اکساتا ہے
مرمریں باہیں، لچکتی ہوئی ڈالی سی کمر

وجہ رنگینیٔ امروز تو ہو سکتی ہے
پر تنوع بھی تو اِک لازمۂ ہستی ہے
ایک ہی تان پہ رک جائے تو نغمہ کیسا
ایک ہی پھول گلستاں کبھی کہلاتا ہے

سردار انور طالب شیرازی

اپریل:

ایک پینٹنگ،

ایک پینٹنگ

جنگلی لباس میں ایک پیکرِ گداز!
چل رہا ہے جھاڑیوں میں سانپ جھُوم جھُوم کر
اُڑ رہا ہے مور اپنے بال چوم چوم کر
جھیل مانگنے لگی شام کی ہوا سے ساز
ایک بار، تین بار
دستِ صندلی اُٹھے
پاؤں لہر کھا گئے
جسمِ ناز کے شرار
جھیل کے کنارے مست ہو کے ناچنے لگے!
جنگلی جوان شام کو سکون پا گئے ——!
جھونپڑوں سے اپنے اپنے ساز لے کے آ گئے

آسماں سے چاند اور ستارے جھانکنے لگے
چاندنی میں جاگ اُٹھی
سو رہی تھی صبح سے
بول کیسے خواب تھے
میرے "بدھ" کی مورتی
جھاڑیوں سے سرخ زرد پھول توڑ توڑ کر!
ایک بار، تین بار، اور اب تو بار بار
مورتی پہ جنگلی حسینہ کرتی ہے نثار
چشم و لب کے رقص پر ہاتھ موڑ موڑ کر!
رقص کی شراب میں
مور مست ہوگیا
سانپ جیسے سوگیا
عکسِ ماہتاب میں
ایک پیکرِ گداز اور ناچنے لگا،
ڈھولکوں کی مست چیخ اور تیز ہو گئی
جنگلی حسینہ اور شعلہ ریز ہو گئی
مورتی کا دیوتا خود ہی مسکرا اُٹھا
اور جیسے چونک کر
رقص بند ہو گیا
کس قدر غرور تھا
کامیاب رقص پر

سلام مچھلی شہری

مئی : خلا،
دھارے کا موڑ،
سراب،
گریز،

خلا

اب دھندلکے میں ہوئی جاتی ہے تحلیل شفق
اور پھسلتا ہوا ان مغربی ڈھلوانوں سے
جانے کس غار میں جا ڈوبا اُجالا دن کا
میں نے بھی جمع کئے ہیں خس و خاشاک بہت
ڈھونڈ کر راکھ سے اب ایک شرارِ تازہ
دشت کے سینے پہ پھر جوت جلاؤں اپنی
کچھ تو ہو جائے گی بے نور فضا کی تسکیں۔
خس و خاشاک سے اُٹھا ہے دھوئیں کا بادل
ظلمتِ شب سے ہم آہنگ ہیں جس کی تہیں
جس طرح ساز سے گھبرا کے صدا اُٹھتی ہے
دائرے بنتے ہیں اور بن کے بگڑ جاتے ہیں
کہیں گہری ہیں لکیریں کہیں ہلکا سا غبار

جس طرح ذہن میں اک نقش کا عکس تخلیق،
کوئی صورت مگر اس عکس سے ڈھلتی ہی نہیں
دائرے پھیلتے ہیں بڑھتے چلے جاتے ہیں
جیسے چھا جائیں گے آفاق کی وسعت پہ مگر
پھیل کر رات کی تاریکی میں کھو جاتے ہیں
اب تو شعلے بھی بھڑک اُٹھے ہیں زیرِ خاشاک
اب دھواں لوٹ کے مرکز پہ نہیں آسکتا
شب کے ظلمات میں مل سکتا نہیں اس کا نشاں
اور فضاؤں میں بدستور خلا باقی ہے

ریاض احمد

دھارے کا موڑ

دھارے کے موڑ سے خبردار
محلوں سے بہت پرے ہیں طوفاں

رہتی ہے یہاں سدا جوانی
ہے لکشمی ان گھروں میں رانی

لیکن یہ پکارتا ہے میداں
دھارے کے موڑ سے خبردار

جمنا کی کمر لچک چکی ہے

تہ خانوں میں فوج چل رہی ہے
طوفاں کی ہوس مچل رہی ہے

پانی کی نظر بہک چکی ہے
دھارے کے موڑ سے خبردار

کھیتوں کی زمیں دھنس رہی ہے

بدمست پڑے ہیں راجہ رانی
گو محلوں کی نیو ہے پرانی

بے فکری پہ موت ہنس رہی ہے
دھارے کے موڑ سے خبردار

لہروں نے سنبھال لیں کدالیں

آغاز ہوئی نئی کہانی
شاید ہی بچے یہ راجدھانی

بیکار ہیں پتھروں کی ڈھالیں
دھارے کے موڑ سے خبردار

علی جواد زیدی

سراب

خشک لب نغمہ فراموش ہوئے
دور پازیب کی جھنکار فضا کے دل میں
آخری سسکیاں لیتے ہوئے پیوست ہوئی
کس نے سر تھام لیا؟
زندگی کس کے لئے بارِ گراں سے کم ہے؟
موت کس کے لئے تسکینِ دل و جاں نہ بنی؟

میں نے دیکھا ہے سراب
سُرخ صحرا میں چمکتی ہوئی باریک ردائے سیمیں
ریت کے ناچتے ذرّوں کی بہار
جھلملاتے ہوئے پُرشوق اشاروں کا فریب!
آخری بار لپکتی ہوئی موجوں کا سہارا لیکر

گرتا پڑتا ہوا بڑھ جاتا ہے تنہا راہی

میں نے دیکھا تھا سراب
احمریں ہونٹوں پہ معصوم تبسّم کا نکھار
جاگ اُٹھے تھے ہزاروں جذبات
مدتوں عارضِ گلگوں کی فسوں کاری میں
چشمِ حیراں کو رہی نقشِ حقیقت کی تلاش
وقت سے پہلے مگر کس نے کِسی کو سمجھا ؟
دل کے اسرار چھپے رہتے ہیں ،
اپنی تاریک کمیں گاہوں میں

الطاف گوہر

گریز

اُٹھا کے کوئی اندھیرے میں پھینک دے ان کو
حسین چاندنی راتوں سے خوف کھاتا ہوں
اُبھر کے ذہن کے پردوں سے ایک دوشیزہ
(وہ جس کا جسم بھی اِک چاندنی کا پیکر تھا)
کچھ ایسے میری سیہ بختیوں پہ ہنستی ہے
میں خود سے بھاگتا پھرتا ہوں، چھُپ نہیں سکتا
کہ چاند رہتا ہے شب بھر مرے تعاقب میں ——
حسین چاندنی راتوں کی نیم عریانی
مری حیات کے اسرار فاش کرتی ہے

اُداس تاروں بھری، سانولی سیہ راتیں
کِسی خلوص میں ڈوبی ہوئی دلہن کی طرح

خموش بیٹھ کے آنسو بہاتی رہتی ہیں
نہ انکے ہونٹوں پہ شکوہ، نہ شعلے آنکھوں میں
مرے سلگتے ہوئے ذہن کی تسلّی کو
دہکتی آنکھوں پہ رکھ کر سکوں کے نازک ہاتھ
مجھے مری ہی نظر سے چھپاتی رہتی ہیں —
مگر وہ پیکرِ دوشیزگی — کبھی نہ کبھی
اُبھر ہی آتا ہے مشرق کے کوہساروں سے
میں خود سے بھاگتا پھرتا ہوں چھُپ نہیں سکتا۔

سیّد ضیا جالندھری

جون :

ترغیب ،

ترقی پسند ادب ،

صبح سے شام تک ،

ترغیب

مسلسل ہوا نے

سمیٹے ہیں پتّوں کے بکھرے خزانے
سفیدے کی شاخوں سے تاروں کا جھرمٹ
محبّت کے فتنوں کا جادو جگانے

چلا آ رہا ہے

اندھیرے میں روشن

زمستاں کی راتوں کا یخ بستہ جوبن
بھڑکنے لگا ہے سلگتا تصوّر
تمنّا کی ایذا پرستی کا دامن

بڑھا جا رہا ہے

اُلجھنے سے حاصل ؟

ہوتی ہے نہ آسان ہوگی یہ مشکل
بلاخیز موجوں کے رستے ہیں تنہا
کھڑا ہے سمندر کا صد چاک ساحل

کوئی گا رہا ہے

قیُّوم نظر

ترقی پسند ادب

اِس کو ہاتھ لگایا ہوگا، ہاتھ لگانے والے نے
پھُول ہے رادھا، بھنورا، بھنورا بھنورے نے ہاں کالے نے
جمنا تٹ پر ناؤ چلائی، ناؤ چلانے والے نے
سکھیاں کب تھیں، لاج بچائیں، کچھ نہ سنی متوالے نے
کام نہ آیا، بات نہ رکھی، اپنے دل کے اُجالے نے

دل کا اُجالا، بنسی والا میٹھی جس کی بانی ہے۔
بنسی دھن کی بات نہ کہنا۔ یہ تو پرانی کہانی ہے
اب تو ساری دنیا بدلی ہر صورت انجانی ہے
دل میں سب کے چھایا اندھیرا ظاہر ہی نورانی ہے
یہ بھی رُت ہے مٹ جائے گی ہر رُت آنی جانی ہے
اِتنی بات کہ دل بے چین رہے جگ میں لافانی ہے

دل بے چین ہوا رادھے کا کون اسے بہلائے گا
جمنا تٹ کی بات تھی ہونی، اب تو دیکھا جائے گا
چپکے چپکے سہے گی رنگ وہ رادھا جو بھی سر پہ آئے گا
اودھو شیام پہیلی رہتی دنیا کو سمجھائے گا
پریم کتھا کا جادو سننے والوں کے دل پہ چھائے گا
یہ تو بتاؤ کون سورما اب کے ہاتھ لگائے گا

میراجی

صبح سے شام تک

ایک شوخی بھری دوشیزۂ بلّور جمال
جس کے ہونٹوں پہ ہے کلیوں کے تبسّم کا نکھار
سیگوں رُخ سے اُٹھائے ہوئے شبرنگ نقاب
تیز رفتار، اُڑاتی ہوئی کہرے کا غبار
اُفقِ شرق سے اٹھلاتی ہوئی آتی ہے
مست آنکھوں سے برستا ہے صبوحی کا خُمار
پھول سے جسم پہ ہے شبنمی زرتار لباس
کروٹیں لیتا ہے دل میں اسے چھونے کا خیال
آنکھیں ملتے ہوئے جاگ اُٹھتے ہیں لاکھوں احساس
یہ حسینہ مجھے اُکساتی ہوئی آتی ہے
نغمے گونج اُٹھتے ہیں پازیب کی جھنکار کے ساتھ
نقرئی انگلیاں آفاق پہ لہراتی ہیں
جسم کے لوچ میں سیماب کی موجیں ہیں رواں
لہریں باہوں کی تھرکتی ہوئی بل کھاتی ہیں

ناچتی ناچتی بڑھتی ہے مگر رکتی ہوئی

دل کو برماتا ہے اس شوخ کا بھرپور شباب
اس کی گرمی مری سانسوں سے کوئی دور نہیں
فرشِ مخمل پہ بچھی جاتی ہیں اس کی نظریں
نیلے آنچل میں دمکتی ہوئی شفاف جبیں
اُٹھی مشرق سے تو مغرب کی طرف جھکتی ہوئی

مضمحل چہرے کی زردی میں ہے رخصت کا پیام
سرمگیں آنکھوں پہ جھکنے کو ہیں لمبی پلکیں —
قرمزی دھاریاں چھن چھن کے سیہ زلفوں سے
جذب ہو جاتی ہیں دہکے ہوئے رخساروں میں
زلفیں بکھری ہوئی شانوں سے ڈھلک آئی ہیں
سر جھکائے ہوئے، منہ پھیر کے، خاموشی سے
دور مغرب کے دھندلکوں میں چلی جاتی ہے
میرے دل میں ہیں سلگتی ہوئی یادیں اُس کی
انہیں یادوں سے مری روح جلی جاتی ہے
کتنی تاریکیاں چپ چاپ سرک آئی ہیں

سید ضیا جالندھری

جولائی :

آتش دان کا بُت ،

کنارِ دریا ؛

آتش دان کا بُت!

اَن کہی یہ ہے جو پتھّر نے کہی، میں نے سنی

نوجوانی کی گراں خوابی میں

ابھی کُھلنے ہی کو تھی اسکی سجیلی کایا

جانا پہچانا وہیں لرزا کسی کا سایہ
توڑے بیداری نے سپنوں کے روپہلی جالے

جھومی بکھری ہوئی زلفوں کی جبیں پر چھایا
چوڑیاں بول اُٹھیں گیت کھنک میں ڈھالے

دھیان، آنکھوں میں دھڑکتے ہوئے دل کو لایا
نیند کے جھونکوں کو پڑنے لگے جاں کے لالے

کسمساتے ہوئے بیتابی میں

کھولی آنکھیں تو وہ سپنے کی تھی جھوٹی مایا

دل کو کھاتا ہوا مبہم دھڑکا

کانپ کانپ اُٹھا ننھا سا کلیجہ تھر تھر

شمع تنہائی سے ملتی نہ تھی گھبرائی نظر
یاد آجاتی تھی خاکستر پروانۂ دل

تہہ بہ تہہ سایوں میں لپٹی ہوئی سیمائے سحر
طعنہ دیتی تھی کہ روشن نہیں کاشانۂ دل

پھوٹتا جاتا ہے بے چھلکے ہی پیمانۂ دل
اور اشکوں میں خوشی کے نہ ستارے نہ قمر
آج آہٹ پہ نہ پتّہ کھڑکا
نور کے گولے کو جا لیگا ابھی شب کا سفر
وہ خلش ملنے کی محرومیٔ سنگیں میں ڈھلی
یوں ہی نیند اکھڑی کسے آنا تھا، آتا جو کوئی
بُت تو خاموش ہے اب سوئیں بہت رات گئی

مختار صدیقی

کنارِ دریا

شہر سے، وحشت کی زنجیروں سے دور
خواب سے نا آشنا سنگین دیواروں سے دور
جبر سے، پابستہ انسانوں سے دُور

چاندنی کے چاندی سے پھُول
پُرسکوں پیڑوں کے نیچے خاک پر بکھرے ہوئے
اوس میں بھیگی صدائیں ——
جھینگروں کی، نرم لہروں کی، صدائیں ——
سبز خواب آلود پتّوں پر حریری جال پھیلاتی ہوئی

کیوں تھکن سے چُور بازو پھر سے پھیلا کر اُڑوں؟

کیوں ہوا کے تُند طوفانوں سے پھر جا کر لڑوں؟
سنگِ خارا کی سیہ تپتی چٹانوں پہ رہوں؟
کیوں نہ سب کچھ بھُول کر
گرم پیشانی کو ٹھنڈی ریت پہ رکھے ہوئے
سو رہوں، سوتا رہوں ——

محمّد صفدر

اگست :

جدائی کی پہلی رات ،

حسنِ قبول ،

حرامی ،

زندگی ،

شام ،

جُدائی کی پہلی رات

نہ جانے آج کی شب اس قدر طویل ہے کیوں

جہاں سے چاند چلا ہے، وہیں پہ رُک سا گیا — کسی خیال میں یوں کھو گیا، کہ جُھک سا گیا
ستارے جم سے گئے سرمئی خلاؤں میں — رواں ہیں نیند کی انگڑائیاں ہواؤں میں
فضا پہ موت کی افسردگی ہے چھائی ہوئی — غنودگی سی نظاروں میں ہے سمائی ہوئی
جدھر نگاہ اُٹھے، انجماد طاری ہے — سکوت ذوقِ سماعت پہ کتنا بھاری ہے
ندی کے موڑ پہ لہروں میں گونج بھی نہ رہی — اکیلے نیم کی شاخوں میں بے کلی نہ رہی
افق پہ شام کو جو ابر گنگنایا تھا — فقط اُمید کو بیدار کرنے آیا تھا

لپیٹ کر مرے احساس کو دھندلکوں میں — یہ کون بیٹھا ہے افکار کے محلکوں میں
یہ کس نے وقت کے پر نوچ کر بکھیر دیئے — یہ کس نے رُخ ہی لپکتے پلوں کے پھیر دیئے
نہ کٹ سکی اگر اک رات بھی جدائی کی — تو کون چھانے گا پہنائیاں خدائی کی
نہ چاند ڈوبتا ہے اور نہ تارے ٹوٹتے ہیں — نہ سمت شرق سے انوار صبح پھوٹتے ہیں
نہ جاگنے کی ہوس ہے نہ نیند آتی ہے — بس اک خلش سی کلیجے میں سرسراتی ہے

نہ جانے آج کی شب اس قدر طویل ہے کیوں

احمد ندیم قاسمی

حسنِ قبول

گرج رہا ہے سیہ مست پیل پیکر ابر
اُداس کوہ کی چوٹی پہ ایک تنہا پیڑ
اُٹھا رہا ہے سوئے آسماں وہ تنہا شاخ،
مہرک رہی ہے ابھی جس میں زندگی کی نمی۔
بڑھا ہو جیسے کسی بے نوا کا مفلس ہاتھ
ہجومِ یاس میں اک آخری دعا کے لئے۔

"برس محیطِ کرم! ایک بار اور برس!
"بس اک بار مجھے اور پھول لانے دے!
"تڑپ رہا ہے ابھی مجھ میں سازو برگِ نمو
"یہ میری کلیاں یہ پتے ابھی تو زندہ ہیں
"اُتر، اُتر، میرے دامن پہ پھول برسا دے!"

محمل کے ابر کے پردوں سے بے حجاب آیا—
دعائے نیم شبی کا مگر جواب آیا—
شرارِ برق کا ہیجان۔
پیڑ—طور بدست،
ز فرق تا بقدم ایک پھول۔
حسنِ قبول!

تصدّق حسین خالد

حرامی

قدرت کے پُرانے بھیدوں ہیں جو بھید چھپائے چھُپ نہ سکے
اِس بھید کی تو رکھوالی ہے
اپنے جیون کے سہارے کو اس جگ میں اپنا کر نہ سکی
یہ کم ہے کوئی دن آئے گا وہ نقش بنانے والی ہے
جو پہلے پھُول ہے کیاری کا پھر پھلواری ہے مالی ہے
غیروں کے بنائے بن نہ سکے اپنوں کے مٹائے مٹ نہ سکے
جو بھید چھپائے چھُپ نہ سکے اس بھید کی تو رکھوالی ہے
یہ سکھ ہے دکھ کا گیت نہیں
کوئی ہار نہیں کوئی جیت نہیں
جب گود بھری تو مانگ بھری
جیون کی کھیتی ہوگی ہری

جو چاہے ریت کی بات کہے   ہم پریت ہی کے متوالے ہیں
کوئی ناچ ناچ کر تھکتا ہے
کوئی سُکھ میں مگن ہو جاتا ہے
کوئی دکھ سے نُور بڑھاتا ہے
کوئی دُور سے بیٹھا تکتا ہے
جو چاہے ریت کی بات کہے   ہم پریت ہی کے متوالے ہیں
جو بھید چھپائے چھپ نہ سکے، جو نقش مٹائے مٹ نہ سکے
وہ بھید وہ نقش ہے دھن تیرا کوئی پھول ہے کوئی مالی ہے
آکاش پہ لاکھوں بادل ہیں کچھ اُجلے کچھ مٹیالے ہیں
سب روپ بڑھانے والے ہیں سب دل گرمانے والے ہیں
کچھ لال اُبھرتے سورج سے
کچھ پیلے چاند کی سج دھج سے
کچھ کاجل جیسی کالی کالی رجنی کے اندھیاروں سے
کچھ دور چمکتے تاروں سے
آکاش کا روپ نکھرتا ہے

جو پل آتا ہے سنورتا ہے اور دل پر جادو کرتا ہے
یہ سورج چاند ستارے سارے اُجالے سارے اندھیارے
قدرت کے پُرانے بھیدی ہیں
جو چاہے ریت کی بات کہے یہ پریت کا گیت سناتے ہیں
ہنستے ہی ہنستے جاتے ہیں
جو دیکھے اسے ہنساتے ہیں
ہر ایک کرن سے پھُوٹتا ہے وہ نور وہ بھید جو چھُپ نہ سکے
اس بھید کی تو رکھوالی ہے

میراجی

زندگی

کاغذ کی کچھ کھڑ کھڑ کھڑ، چاندی کی جھنکار
چند تقاضے بھوک کے، روپہلی گفتار

رات کا پُراسرار اندھیرا
اس میں کہیں اک نور کا ڈیرا
منظر ستھرے، صاف، سہانے
جیسے دھندلا مست سویرا
من پاگل کے الھڑ سپنے
پھسلیں سنبھلیں، سنبھلیں پھسلیں۔

ایک جماہی، ایک انگڑائی رات کو پھر لے آئے
ایک تمنا، ایک کشاکش پھر من پر چھا جائے!
تسکیں کے سائے لہرائیں سات سمندر پار

آئیں راہی ، جائیں راہی
تڑپیں اور تڑپائیں راہی
ایک تمنّا ایک کشاکش
ہر سُو ہر جا حسرت حسرت
خواب بنے رہ جائیں راہی
خواب کی صورت آئیں راہی ، خواب کی صورت جائیں
روندی ہوئی راہیں ویسے ہی پیہم روندی جائیں

انجم رومانی

شام

مشتعل حسن کا انبوہِ کثیر

ہر طرف پھیلتا، بڑھتا، چڑھتا
روندتا، آگ لگاتا، اُٹھا
اب کہاں وقت دل و دوست کی غمخواری کا؟

خون آلودہ اُفق کی زنجیر

پیچ و خم کھاتا پُراسرار دھواں
دور اک ڈوبتی آوازِ گِراں
ہر نشاں جانکنیٔ عشق کی دشواری کا۔

رات کی سُرمگیں زلفوں کے اسیر

ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں، تارے
نوحہ خوانی کو ہیں نکلے سارے
دن کی میّت پہ بھرم کھل گیا عیّاری کا۔

دن — یہی میرے جنوں کی تدبیر
اِک سکون زار سے ٹکراتی ہے
تیرگی بڑھتی چلی جاتی ہے
مرمریں صبح بھی اِک خواب ہے بیداری کا۔

قیوّم نظر

ستمبر : ۱

خرابے ،

خرابے

اِک تمنّا تھی کہ میں
اِک نیا گھر، نئی منزل کہیں آباد کروں
کہ مرا پہلا مکان
جس کی تعمیر میں گذرے تھے مرے سات برس
اِک کھنڈر بنتا چلا جاتا ہے
یہ تمنّا تھی کہ شوریدہ سری
خشت اور سنگ کے انبار لگاتی ہی رہے
روز و شب ذہن میں بنتے ہی رہیں
در و دیوار کے خوش رنگ نقوش
مجھ کو تخئیل کے صحرا میں لئے پھرتا تھا

ایک آفت زدہ دیوانے کا جوش
لے گئے میرے قدم آخر کار
ایک دن اپنے نئے گھر میں مجھے
خیر مقدم کو تھیں موجود جہاں
میری گلچہرہ کنیزیں مرے دل شاد غلام
دیکھ کر اپنی تمناؤں کی شادابی کو
میرے اندیشے کی دہلیز سے معدوم ہوئے
میرے ماضی کے سیہ تاب الم ناک نشان

یہ مگر کیا تھا خیالات تھے، اوہام تھے دیوانے کے
نہ وہ گلچہرہ کنیزیں تھیں نہ دل شاد غلام
در و دیوار کے وہ نقش نہ دیواریں تھیں
سنگ اور خشت کے ڈھیروں پہ تھا کائی کا نزول
اور وہ ڈھیر بھی موجود نہ تھے
گھل گئے تھے کسی آئندہ کی بیداری میں

میرے خود ساختہ خواب
میں اِسی پہلے خرابے کے کنارے تھا نگوں
جس سے شیون کی شب و روز صدا آتی ہے
کِس لئے ہے مری محرومی کی حاسد اب بھی
کِسی منحوس ستارے کی غضبناک نگاہ
اور ادھر بندۂ بدبخت کی تنہائی کا یہ رنگ کہ وہ
اور بھی تیرہ و غمناک ہوئی جاتی ہے۔

ن۔ م۔ راشد

اکتوبر:

دوسری عورت سے،

گاڑی میں،

فاشزم،

مراجعت،

دوسری عورت سے

میں تھکا ماندہ مسافر ہوں چلا جاؤں گا
اِک گھڑی راہ میں تم مجھ کو بسر کرنے دو
ایک ہی پل کے لئے چاند ستارے، بادل
پھیلے آکاش پہ آتے ہیں چلے جاتے ہیں
ایک ہی پل کے لئے راہ میں ہر پیڑ کی چھاؤں بھی گھنی ہوتی ہے
زیست کی راحتیں ایک پل کے لئے ایک اشارہ سا کئے جاتی ہیں۔
جیسے ناٹک میں کوئی آتا کوئی جاتا ہے
صاف کہتے نہیں لیکن پھر بھی
ان کے ہر ایک اشارے کا یہ مطلب ہے کہ اک پل کو مسافر ٹھہرے۔
ایک ہی پل کا تماشہ ہے یہاں
ایک پل جان کے انجان تو بن سکتے ہیں
اور گر عمر کا ہو ساتھ ــــ زمانہ آئے،
آئے، آتا ہی چلا جائے۔ تو پھر یُوں سمجھو

جانی پہچانی ہر اک بات ہُوا کرتی ہے
جانی پہچانی کسی بات سے کیا رغبت ہو؟
پل کا جادو ہے انوکھا جادو!
نت نئی باتوں کو لے آتا ہے
اور چپکے سے چلا جاتا ہے
ایک پل شرم کا دشمن ہے کہ جیسے کبھی خلوت سے کوئی دوشیزہ
پیرہن سیج پہ رکھ دے۔ دَرِ استادہ سے باہر آئے۔
اور باہر ہو ہجوم
اپنے حلقوں سے نکلتی ہوئی آنکھوں کا ہجوم
اور وہ عریاں عورت
بڑھتی ہی جائے، نہ رُکنے پائے
اُس کو کچھ سوچ نہ آئے کہ یہ بیتاب ہجوم
مرے پیچھے اگر آیا تو میں مٹ جاؤں گی
ایک پل ایسے ہی آتا ہے چلا جاتا ہے۔

تم بھی یہ چاہتی ہو یوں بڑھ جاؤ۔
ایک ہی پل کے لئے پاس آؤ

لیکن افسوس مجھے عمر کا ہی ساتھ پسند آتا ہے
جانی پہچانی کسی بات سے رغبت ہی نہیں ہے تم کو
تمہیں ہر راہ میں انجان ملا کرتے ہیں
کیا نگاہوں میں تمہاری آکاش
کوئی تاریک نہاں خانہ ہے،
جس کی تاریکی میں اک پل کے لئے چاند، ستارے، بادل
جیسے آتے ہیں چلے جاتے ہیں ؟

ایک پل ٹھہرو ذرا، ایک ہی پل
اِک کرن جاگی ہے تاریکی میں
گر کوئی چاند، ستارا، بادل
چلتے چلتے ہوئے بہتے ہوئے چاہے کہ اُسے ایک ہی پل کا آغوش
دامنِ عمر کے پہلو میں سُلا دے تو یہ ناممکن ہے
وہ بھی اک پل کے لئے آئی تھی
ایک پل آیا، گیا،
اور وہ ساتھ گئی۔
لو! کرن شعلہ بنی

کیوں تھکا ماندہ مسافر ہی کہیں راہ میں رہ جاتا ہے؟
میں وہ پژمردہ مسافر تو نہیں
میں ہوں اب ایک ہجوم —
اپنی ناکام تمنّاؤں کا بے تاب ہجوم
دل کی دھڑکن جسے کہتی ہے وہ پل بیت گیا، بیت گیا، بیت گیا،
اور یہ پل بھی چلا جائے گا۔

پیرہن سیج پہ رکھ دو، درِ استادہ سے باہر آؤ
اِک گھڑی درد کے تاریک نہاں خانے میں
تم سے مل کر ہی بسر کر لوں گا
میں تمہیں چاند سمجھ لوں گا، لچکتا ہوا چاند
اور پھر دل کو یہ سمجھاؤں گا —— تو بادل ہے
ایک ہی پل کو برستا بادل!
تجھے اِک پل کو برستے ہوئے مِٹ جانا ہے۔

میراجی

گاڑی میں

یہ بیکراں فضائیں جہاں اپنے چہرے سے
پردہ اُلٹ دیا ہے نمودِ حیات نے
شاداب مرغزار کہ دیکھی ہے جس جگہ
اپنے نمو کی آخری حد، ڈال پات نے
گنجان جھنڈ، جن کے تلے کہنہ سال دھوپ
آئی کبھی نہ سُونت شعاعوں کا کاتنے،
پیڑوں کے شاخچوں پہ چہکتے ہوئے طیُور
تاکا جنہیں کبھی نہ شکاری کی گھات نے
تم کِتنے خوش نصیب ہو، آزاد جنگلو!
اب تک تمہیں چھوا نہیں انساں کے ہات نے
اب تک تمہاری صبح کو دھندلا نہیں کیا
تہذیب کے نظام کی تاریک رات نے

پھینکی نہیں تمہارے مقام بلند پر
کوئی کمند سلسلۂ حادثات نے
اچھے ہو تم کہ تم کو پریشاں نہیں کیا
انسانیت کے دل کی کسی واردات نے
اے وائے اس حسین بیاباں کو کس طرح
نیندوں سے بھر دیا ہے، نسیمِ حیات نے
اِن وسعتوں میں کلبہ و ایواں کوئی نہیں
اِن کنکروں میں بندہ و سلطاں کوئی نہیں

مجید امجد

فاشزم

گورے جسموں کو جواں رکھتے ہیں بندر کے غدود
ہم کو ترکے میں ملی، ہائے جوانی کی پکار
گرم ملکوں کی کلی آج کھلی، کل کو مٹی
بہتی دھارا پہ حبابوں کی بقا کیا معنی ؟
برف زاروں کی مگر نرگسِ سرمایہ نژاد!
صدیاں کھا چکنے پہ افسانوں کی عذرا ہی رہی
آہ وہ عذرا وہ نوخیز دلوں کی مسجود
اُف وہ کردارِ پُراسرار کہ جس کو برسوں
ہالے پہناتے تھے بچپن کے انوکھے سپنے
بربریت میں رہی جس کی جوانی معبود
اس کے اس دَور میں معبد تھے تصوّر اپنے!
پھر ہوا گیان کہ ہر شے تھی طلسماتِ خیال

من گھڑت بات تھی، اندازِ بیاں سے چمکی
آتشیں غسل سے پائندہ، جوانی ہو جائے؟
یہ کہانی بھی حقیقت کی زباں سے چمکی

اب تو آنکھوں میں تھا عذرائے حقیقی کا جمال
چھب نویلی تھی مگر چیخ وہی شام وہی
ایک اک جلوہ تھا خورشید قیامت لیکن
تین سو سال سے تھا روئے دلآرام وہی

جانے پھر کیسے ہوئی حاجتِ نیرنگ شہود
دیکھتے دیکھتے بدلا یہ شبستانِ وجود!!
یعنی سرمائے کی عذرا نے لیا اور جنم
آتشیں غسل کا جوہر بنے، بنا رکے غدود

روپ البیلا تھا، مہتاب وہی، بام وہی
پہلی کایا کی مگر چھاؤں خبیث و مردود!
اس نئے روپ میں یہ فانی و باقی کی قیود
ایک ہی جنبشِ ابرو سے تھیں پارہ پارہ
بے اماں گردشِ ایام کی گنگا جمنی

بن گئی لاکھوں برس پہلے کا ٹوٹا تارا
پیرِ اوقات نے تھک ہار کے ڈالی ہے کمر
اتنا جھکنے سے کہولت کی کماں ٹوٹ گئی
اب تو پاتال ہیں تیروں سے تہی ہے ترکش
اسلحہ خانوں کو فاتح کی نظر لوٹ گئی
شکر ہے طے تو ہوئیں "عالمِ ظاہر" کی حدود
گورے جسموں کو.......

مختار صدیقی

مراجعت

طائرِ زیست کے یکلخت جو بندھن ٹوٹے
خرخشے مٹ گئے دنیا کے جھمیلے چھوٹے
سرخوشی تختِ رواں لے آئی
اور میں اُڑنے لگا سوئے فلک

آنِ واحد میں مگر ٹوٹ گیا یہ بھی طلسم
ہوگئی راہ میں حائل دیوار
میرے محبوب عزیزوں کی فلک رس فریاد
نالہ و آہ و بکا، چیخ و پکار

لوٹ آیا ہوں میں دنیا کو دکھانے کے لئے
بھلا انسان کہیں مرتا ہے؟

جبتک اُس کو نہ کریں ختم عزیز
اپنے ارمانوں کی تکمیل پہ کر کے مجبور
اور وہ اُن کی محبت کے طفیل
سختیاں جھیلے، سدا رنج سہے
روز گھل گھل کے مرے —— مرتا رہے
طائرِ زیست کے یکلخت نہ بندھن ٹوٹیں
خرخشے مٹ نہ سکیں اور نہ جھمیلے چھوٹیں

عبدالمجید بھٹی

نومبر :

آخری سہارا ،

خزاں کی رات ،

آخری سہارا

چراغ ہی سے اگرچہ چراغ جلتا ہے
مگر نہ مہر سے چشمِ خرد ہوئی روشن
نہ اِن ستاروں سے کوئی سراغ ملتا ہے

چراغِ طور، چراغ قمر، چراغِ بہار
ہر ایک سمت چراغاں ہر اک طرف انوار

یہ شاہراہ، مگر پھر بھی تیرہ روز رہی
یہ زندگی کے مسائل سلجھ سکے نہ کبھی

سکوت — لاکھ صداؤں کا گونجتا مدفن
صدا — ہزار خموشی کا اک ہجومِ شکست
بہار — لاکھ خزاؤں کے خوں کا فوّارہ
خزاں — ہزار بہاروں کی حسرتِ بے دست

یہ پیچ اِن کے سوا اور بھی کئی عقدے
نہ فلسفہ ہی، نہ "تحییر" ہی کھول سکتا ہے
نگاہِ گرمِ تجسس کا قول "سکتہ" ہے

مگر شکست سے بدتر ہے اعترافِ شکست
مَیں خوش ہوں، خوش ہوں کہ ناکامیوں سے کام نہیں
مری نگاہ کو اِن خامیوں سے کام نہیں
مرے لئے ہے ابھی تک پیامِ راحت و عیش
تری نگاہ میں، تیری گداز باہوں میں
جو راز پھولوں کی پیغمبری سے مل نہ سکا
وہ راز مجھ کو ملا ہے تری نگاہوں میں
اگر حیات کے رازوں کو پا نہیں سکتا
تو تیرے چہرے کے پھولوں میں بھول سکتا ہوں
یہ کم نہیں ہے سکونِ حیات کی خاطر
کہ تیرے حسن کے جھولوں میں جھول سکتا ہوں

یوسف ظفر

خزاں کی رات

یہ بہاروں کی خوابگاہِ جمیل!
ریشمیں زرد زرد خاموشی
کتنی گہری ہے! کتنی شیریں ہے!
کیسے بکھری پڑی ہے پتوں پر
کیسے الجھی ہوئی ہے شاخوں میں

اِس میں رنگینیٔ شراب بھی ہے
کیف بھی مستیٔ شباب بھی ہے
جلوۂ لالہ و گلاب بھی ہے
صاف آئینۂ خموشی میں

ایک ہلکا سا عکسِ صوت نہیں
شبِ فرقت طرب کی موت نہیں!
میری ویران خوابگاہوں میں

میری سنسان سی نگاہوں میں

وہ رسیلی شبِ خمار بھی ہے
لذتِ گیسو و عذار بھی ہے
تیرا وہ نازِ خود سپار بھی ہے

سیکڑوں سائیں سائیں کرتی رات
خامشی کے بسیط سایوں میں
چاندنی سے لپٹ کے سوئی ہے
اِس سے پھوٹیگا وہ شگوفۂ صبح
جس سے رنگینیاں چھلکتی ہیں

آج کی شب شبِ خزاں بھی ہے
صبحِ خنداں کی رازداں بھی ہے
سوزِ اُلفت کی داستاں بھی ہے

محمدؐ خلیل الرحمٰن

دسمبر:

"ڈل دریا سمندر وں ڈونگھے"،

مشورہ،

"دِل دریا سمندروں ڈونگھے"

اِتنی آنکھیں! اتنے ماتھے! اتنے ہونٹ!
چشمکیں۔ تیور۔ تبسّم۔ قہقہے
اس قدر غمّاز! اتنے ترجماں!
اور پھر بھی لاکھ پیغام ان کہے!

لاکھ اشارے جو ہیں اَن بوجھے ابھی،
لاکھ باتیں جو ہیں گویائی سے دُور۔
جو ہیں دل کی کُنج نا موجود میں،
روز و شب موجود، پیچاں، ناصبور!

کون اندھیری گھاٹیوں کو پھاند کر،
جائے ان پُر شور سنّاٹوں کے پار
گونجتے ہیں لاکھ سندیسے جہاں
کان سن سکتے نہیں جن کی پکار!

پُرجبینوں پر لکیریں۔ موج موج
کتنے افسانوں کی ژولیدہ سطور
اَنکھڑیوں میں تھرتھراتی ڈوریاں
کتنے قِصّوں کی زبانِ بے شعور
جامِ لب کی کھنکھناہٹ میں نہاں
کتنے میخانوں کا شورِ بے خروش!
اِک تبسّم! اک تکلّم! اک نگاہ!
کتنے احساسات کی صوتِ خموش!

کون اُلٹ سکتا ہے یہ بوجھل نقاب؟
پردہ در پردہ، حجاب اندر حجاب
اِس طرف میں گوش بر آوازہ ہوں!
اُس طرف ہر ذرّہ اک بجتا رُباب!
کِس کو طاقت؟ کِس کو یارا؟ کِس کو تاب؟
کون ان بیاکل صداؤں کو سُنے؟
اور ضمیرِ ہر صدا میں ڈوب کر
کون دل کے باغ کی کلیاں چُنے؟

کاش میں اتنا سمجھ سکتا کبھی!
جب کوئی کرتا ہے مجھ سے ہنس کے بات
کیا یہ ہو سکتا ہے وقتِ گفتگو
اس کا دل بھی ہنستا ہو ہونٹوں کے ساتھ؟

مجھ خرابِ آرزو کے حال پر
ہاں ٹپکتی ہے کسی کی آنکھ جب
مجھ کو ڈس جاتا ہے یہ چبھتا خیال
اس کا دل مجھ پر نہ ہو خندہ بلب

کیا یہ سب سچ ہے جو کچھ کہتے ہیں ہونٹ
ہونٹ دھبتے روح کے قرطاس پر!
ہونٹ! قعرِ دل کے دروازے پہ قفل
ہونٹ! مہریں نامۂ احساس پر!

اور آنکھوں پر بھی کس کو اعتبار؟
آنکھیں! پردے روزنِ ادراک کے!
کس طرح سمجھیں رموزِ زیست کو
آئینے پر دو کھلونے خاک کے؟

کس طرح مانوں کہ یہ سب سچ ہے سچ
مجھ سے جو کہتے ہیں اس دنیا کے لوگ؟
چھو سکا ہے ان کے سینوں کو کبھی،
میرے دل کا درد، میرے من کا روگ؟

مجید امجد

مشورہ

مانتی ہوں! سہروں کے پھول آپ کھلتے ہیں
اور بر زمانے میں بن تلاش سے ملتے ہیں
کاہلی کی مسند سے باپ بھی تو ہلتے ہیں
گھر پہ آئے قسمت کیوں دے صدا کہ حاضر ہوں

تم پہ ہے "بڑی" ابتک بن بیاہ بیٹھی ہے
دیکھتی ہے کنبے کی رسم و راہ بیٹھی ہے
پاک دامنی سے ہے داد خواہ بیٹھی ہے
مجھ پہ ہو تو جو مل جائے اُس کو ہاتھ پکڑا دوں

بختیار کی نانی! کون تھی؟ پنہاری!
احتشام کی دادی حسن بام بازاری
خاندان رشدی تھا مرکز غلط کاری
چھان بین اور ایسی چھان بین بے بس ہوں

باپ ہیں یہاں کچھ میل اور ماں ادھر کھوٹی
یہ زکوات کا پیسہ، وہ حرام کی روٹی
اس کی آبرو ڈبلی، اُس کی بے کسی موٹی
اونچ نیچ کی بابت سوچ لو کہ سنتی ہوں

لڑکیوں کی دشمن ہے وہ پہر جوانی کی
ولولوں پہ کھلتی ہے آنکھ پاسبانی کی
نوکروں پہ ہوتی ہے "مشق" دستانی کی
مشورے میں دل کی بات کیوں زبان پر روکوں

کل فلاں فلاں لڑکی نام اُچھال کر چلدی
انتہا پہ ہر تیلی پَر نکال کر چل دی
"رکھ رکھاؤ" کے سر پر خاک ڈال کر چلدی
یہ مثال کافی ہے اور کیا حوالہ دوں

جانتے ہو پردے کا گھر قفس نہیں ہوتا
اونچ نیچ کا کھٹکا سو میں دس نہیں ہوتا
دس میں پانچ وہ "تجین" جن پہ بس نہیں ہوتا
نقل کفر کے اندر کفر کب سمجھتی ہوں

تم ہو دوسرا کوئی اس طرح اگر کہتا
"سوئے زن" کا "خمیازہ" سطحِ فرش پہ بہتا
حملۂ حمیت پر مارتا کہ مر رہتا
مجھ سے ہو نہیں سکتا حرفِ ناسزا سُن لوں

منتظمِ خانہ داری میں تم کو آج تک ٹوکا
حرفِ جا و بے جا پر میں نے ہاتھ کب روکا
"سائرہ" کا رشتہ ہے واسطہ "من و تو" کا
تم زمیں پہ چلتی ہو میں ہوا میں اڑتا ہوں

"غیر کف" میں شادی کا سلسلہ نہ مانوں گا
اب وجد کو پھٹکوں گا نسل و قوم چھانوں گا
پاک صاف ہڈی کو پاک صاف جانوں گا
"شجرہ ہائے ساقط" کو کیا صلائے نسبت دوں

آج سے "بڑی" تنہا باغ میں نہ جانے پائے
جس میں "آہ" شامل ہو وہ ہوا نہ کھانے پائے
وہ تو وہ۔ سلیمہ بھی ڈھول پر نہ گانے پائے
نوجواں گوالہ بھی گھر میں اب نہ آئے۔ کیوں؟

کیا؟ — "بڑی" کو پندرہ دن ہو گئے بخار آتے
کام کاج سے بچتے، ناشتے سے کتراتے
اور کچھ مرض ایسے جو نہیں کہے جاتے
روگ نے جڑیں پکڑیں - اب حکیم بلوا دوں
ہمتیں بڑھاتا ہے ہر طبیب اخلاقاً
طبِّ یوسفی یہ ہے اور طاق پر مخزن
دق نہیں تو نسخے میں "کاسنی" کا کیا کارن
نبض کے بُرے لچھّن! تھامتا ہیں گرتی ہوں
"دق سے موت" ہے اس جا "احتیاطِ کرداری"
فرد فردِ قصّہ پہ شدّتِ نگہداری
"جو نماز پڑھتا ہو وہ کرے نہ مے خواری"
پھر یہ "عصمتیں" لاکھوں ہو رہی ہیں "اغوا" کیوں

شاد عارفی